

شاہ ولی اللہ کے معاشی افکار

الہی بخش جا را اللہ

شاہ صاحب کے نظریات میں سے ایک نظریہ ارتقاءِ عمران و اقتصاد (SOCIO - ECONOMIC

Evolution) کا ہے۔ ان کا یہی نظریہ اسلامی نظامِ معیشت کے لئے ایک حوالہ اور مستحکم بنیاد فراہم کرتا ہے۔ انہوں نے اپنے اس نظریہ میں نظریہ ارتقاء کے بنیادی اصولوں، تبدیل، نظام، صراطِ مستقیم، ارتقاء اور استحکام کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔ انہوں نے اپنے اس نظریہ کو اسلام کی لازوال بنیادی فکر سے حکیمانہ ربط دیا۔ اور اس تمام حرکیت کی بنیاد ایک ایسی فکری وحدت پر رکھی جو تمام تبدیلیوں کا منبع ہے مگر خود کوئی تبدیلی قبول نہیں کرتی۔ گویا خود غیر متبدل ہے۔ یہ ہے اسلامی فکر کی وہ وحدت و یکسانیت جو تمام افکار کے لئے مرکزی محور کا کام دیتی ہے۔

شاہ صاحب کا یہ نظریہ عمرانی ارتقائی نظریات میں قدیم ترین ہے اور مستحکم و مکمل بھی ہے۔ انہوں نے یہ نظریات اس وقت پیش کئے جب یورپ کے ماہرین معاشیات کو اس دنیا میں وجود ہی نصیب نہ ہوا تھا۔ کیونکہ انہوں نے یہ ارتقائی نظریات اٹھارہویں صدی کے نصفِ اول میں پیش کئے جب کہ یورپ میں سب سے پہلا ارتقائی نظریہ، خواہ اس کی علمی بنیاد یا ذریعہ کچھ ہو، انیسویں صدی کے نصفِ آخر

ON THE ORIGIN OF SPECIES میں اس وقت پیش ہوا جب ڈارون نے اپنی کتاب

شائع کی۔ مگر عمرانی افکار میں تو ارتقائی نظریات کا ظہور بیسویں صدی کے ابتدائی بیسواں میں ہوا۔

اس تجزیہ میں پہلے ہم شاہ صاحب کے عمرانی ارتقائی نظریہ کا خلاصہ پیش کریں گے اور پھر

تائیس گئے کہ یہ اسلامی نظام معیشت کے لئے مسلسل خود کار حرکتی عمل کی خاطر کیسے بنیاد فراہم کرتا ہے مگر اس سے پہلے دیگر معاشی نظامات کے بنیادی تصور پر کچھ لکھنا ضروری ہے۔

انہ معاشیات نے معاشی مسئلہ کی بنیاد اس بات کو قرار دیا ہے کہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر انسانی ضروریات لامحدود ہیں جب کہ وسائل معاش محدود ہیں۔ لازمی امر ہے کہ انسان کو اقتصاد کا سہارا لینا پڑے گا۔ یہ ہے وہ بنیاد جس پر تمام معاشیات موقوف ہے اور جس پر ہر ایک معاشی نظام استوار ہوتا ہے، یعنی جمیل خواہشات کے مقابلہ میں ذرائع تسکین خواہشات کا بہت ہی کم ہونا۔ ادنیٰ سا مال اس بات کو واضح کر دیتا ہے کہ یہ نظریہ خالصتاً حیوانی، بالکل بے بنیاد اور سراسر غیر منطقی ہے۔ کیونکہ انسان کی بنیادی معاشی خواہشات امدان کا احساس ایک جمیل تقاضا ہے جبکہ اقتصادیات کے مسائل خالص عقل ہیں، یہ نظریہ ان دونوں کے درمیان کوئی ربط نہیں بتاتا۔ پھر یہی نامعقول نظریہ ہے جس نے بلاوجہ دنیا کو دو انتہائی نظریات میں الجھا کر متضارب فریقین میں بانٹ دیا۔ کیونکہ جب معاشی ذرائع کا سوال پیدا ہوتا تو لازماً معاشی ذرائع کے عناصر پیداوار کا بھی سوال پیدا ہوا۔ یہاں سے سوچا بٹ گئی۔ ایک فریق نے یہ سوچا کہ عناصر پیداوار صرف دو ہیں: زمین اور محنت۔ ان میں سے زمین ایک غیر مستعد (PASSIVE) مگر بنیادی عنصر ہے اس کو کسی مستعد (ACTIVE) مال کی ضرورت ہے جو اس کے سینے کو چیر کر اس سے خزانے حاصل کرے۔ اس لئے محنت کا عنصر ناگزیر ہے۔ ان دو کے ملنے سے پیداواری عمل مکمل ہو گیا، اب یہاں تیسرے کسی عامل عنصر ادارہ یا فریق کی ضرورت نہیں۔ جہاں تک حکومت کا سوال ہے یہ انسانی معاشرت و معیشت کا ایک ناگزیر مادہ ہے۔ یہ اپنے دیگر سیاسی، انتظامی اور معاشی فلاح و بہبود کے فرائض کی بجا آوری کے ساتھ معاشی پیداواریت کی جدوجہد میں تنظیمی ضرورت کو بھی پورا کرے گی۔ لہذا حکومت فلاحی کاموں کے لئے بحیثیت تنظیمی عامل اپنا حصہ لے کر باقی محنت کے لئے چھوڑ دے گی۔ اس تصور نے آگے چل کر اشتراکی تصورات پیدا کئے اور ساتھ یہ بھی کہ اس طرح محنت کو اس کا پورا پورا استحصال سکے گا اور محنت بہت خوش ہوگی حکومت اور محنت کے درمیان تیسرا کوئی استحصال کرنے والا نہ ہوگا۔

اس نظریہ میں محنت کو جو بنیادی اہمیت دی گئی ہے اس کا اعتراف بابائے علم الاقتصاد

ایڈم اسمتھ نے بھی اپنی کتاب دولتِ اقوام (Wealth of Nations) کے باطل ابتدائی پیرے میں یوں کہا ہے:-

The Annual Labour of every Nations is the fund which Originally Supplies it with all the Necessities and Conveniences of life which it Annually Consumes.

لیکن ایڈم اسمتھ نے یہ شرط عائد کی ہے کہ قومی دولت کے اضافہ کے لئے ضروری ہے کہ محنت کی پیداواری قوت کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا جائے۔

اس کے مقابل ایک اور نظریہ پیدا ہوا جس میں بتایا گیا کہ ملک کے معاشی قدرتی پیداوار کا مالک سرمایہ دار ہے اور اصولاً اس کو ہونا ہی چاہیے، اس لئے قومی پیداوار میں اس کا حصہ لازمی ہے۔ لہذا تقسیم اس طرح ہوگی، تین حصے سرمایہ دار کے، جو اس ترتیب سے ہوں گے: ایک حصہ بحیثیت مالک زمین، لگان کی شکل میں، دوسرا حصہ مالکِ زر کی حیثیت سے سود کی صورت میں، تیسرا حصہ بحیثیت ناظمِ عناصر پیداوار، منافع کی شکل میں۔ اس کے علاوہ عملِ پیداوار میں جو جو کفایتیں ہوں گی، وہ بھی بہر حال اسی کا حصہ ہیں۔ کیونکہ یہ خالصتاً اس کی صلاحیتوں کا نتیجہ ہیں۔ جہاں تک قومی پیداوار میں محنت کے حصے کا سوال ہے، تو اس نظریہ کے دلائل میں سے ان ہمدردانِ عوام نے بھی جو قومی دولت کا دار و مدار محنت کو بتاتے تھے، بڑی مہفرت کے ساتھ فیصد دے دیا کہ محنت کو قومی دولت میں سے قوتِ لایموت کی سطح سے نڈا نہیں دیا جاسکتا۔

اس نظریہ میں محنت کے ساتھ ہونا قابلِ تلافی لیا دتی کی گئی وہ یہ ہے کہ محنت کو جوئی بحقیقت کسی ملک کی ۱۵ فی صد آبادی ہوتی ہے، مہینے کے کل پرنوں کی صفت میں کھڑا کر دیا گیا ہے اور اس کی قیمت متعین کرنے کے لئے اسے بھی اینٹ پتھر کے ساتھ رسد و طلب کے ترازو میں تو لا گیا ہے اور اس میں بھی ڈاکٹر مارشل کے بقول، اس کے ساتھ بہت بے انصافی کی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بے چاری اتنی قیمت بھی نہیں پاسکی جو اینٹ پتھر کو میسر آتی ہے۔ اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ سرمایہ دار بھی تو محنت کی طرح ایک فرد ہی ہے۔ کیا اس کی قیمت لگانے کے لئے رسد و طلب کا ترازو قائم کیا جاسکتا ہے؟ مگر یہ کہاں ممکن، وہ جنسِ ارزاں تھوڑی ہے۔ وہ ڈیرے لگانا یا ب، گراں مایہ یا نمول

اور نہ جانے کیا کیا ہے۔ اس کی جگہ تو تاج شاہی کے سوا کہیں نہیں۔ اس کی حمایت میں انہوں نے حکومت کو تقصیر کی کہ وہ اپنے واجبات اور ٹیکس لیتے ہوئے سرمایہ دار کے ساتھ خصوصیت سے سادگی اور نرمی کا برتاؤ کرے۔

افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہندوستان کے اس دور میں جہاں غلامی جیسے غیر انسانی ادارہ کے وجود کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ۹۵ فی صد آبادی کو جس پر قدیم مٹی سے محنت کا لیبل چسپاں ہے وہ حیثیت و قیمت بھی نہیں مل سکی جو جاہلیت و تاریکی کے دور میں غلام کو میسر تھی۔

شاہ صاحب کے نظریہ پر تفصیلی معروضات پیش کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ

دور کے تقابلی معاشی نظامات (COMPARATIVE ECONOMIC SYSTEMS) کی بحث پر بھی بلا تازہ نگاہ ڈالیں جائے۔ کیونکہ اس طرح شاہ صاحب کے بنیادی نظریے کو سمجھنے میں خاصی مدد ملے گی۔ عام طور پر معاشی نظامات کی بحث کرتے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت کے درمیان حد فاصل یا ماہرہ الامتیاز کی نجی ملکیت کو قرار دیا جاتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے پچھے نجی ملکیت ہے جو اسے چلا رہی ہے دوسرے نظموں میں سرمایہ دارانہ نظام کو توڑ کر کام کرتا ہے اور اشتراکیت میں حکومت کی قوت اور طاقت۔ مگر یہ تعبیر صحیح نہیں مانی جا سکتی۔ کیونکہ یہ بعد کی ہے۔ یکطرفہ اور جانبدارانہ ہے۔ اس میں سرمایہ دارانہ نظام کو بہتر دکھانے کی کوشش کی گئی ہے جس کا ردوائی اور عمل کو سرمایہ دارانہ نظام کا نام دیا جاتا ہے (بہرچند کہ اس کی اصلی شکل ہمارے سامنے موجود نہیں، اس لئے کہ اس کی موجودہ صورت اصلاح یافتہ ہے اور اسلام کے فلاحی نظام کو دیکھ کر اس کو کافی حد تک قابل عمل بنانے کی کوشش کی گئی ہے) وہ معاشی ذرائع کے عملی استحصال کے سوا کچھ نہیں اور اشتراکیت اس کے خلاف ایک رد عمل ہے۔ یہ رد عمل صرف اینسویں بیسویں صدی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ جب بھی سرمایہ دارانہ استحصال مسدود میں آیا ہے اس کے خلاف مؤثر آواز اٹھی ہے اور ذرائع معاش پر لا محدود اور بلا روک ٹوک ملکیت کی مشق کو پسینے کیا گیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں۔ اس رد عمل کو آگے بڑھانے والوں میں بعض انتہا پسند بھی شامل تھے۔

ایسے لوگ ہر دور اور ہر جگہ میں موجود ہوتے ہیں۔ ان لوگوں نے بے اعتدالیوں کا ارتکاب کیا اور بسا اوقات نشانہ سے ہٹ کر ادھر ادھر تیر مارنے شروع کر دیئے۔ اس کے بعد تاریخ نویس حضرات نے ان کے اقوال و اعمال کی داستان قلمبند کرتے ہوئے اپنی پسند و ناپسند کو دخل بنانے کے لئے خوب

حاشیہ آرائی کی۔ بات کیا سے کیا ہو گئی۔ ادھر صورت حال کو دیگر گوں دیکھ کر خود سرمایہ داروں نے بھی اپنے احتمال کو کسی نہ کسی درجہ میں اور کسی نہ کسی نوعیت سے جاری رکھنے کے لئے مردوں کی اشک شوئی شروع کر دی اور پے در پے پیتر سے بدلتے گئے پھر سرمایہ دارانہ ذہنیت کے دکلاؤں نے زیب داستان کے لئے ادھر ادھر سے غیر معاشی، خلائی ادارات کو لے کر اس نظام سے وابستہ کر دیا۔ حالانکہ ان ادارات کو اگر تعلق تھا تو وہ صرف اسی نظام سے تھا جو انسانیت کی مجموعی صلاح و بہبود کے جذبات پر استوار ہو۔ اور وہ اسلامی نظام کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

بہر نوع، فنائع معاشی پر غیر محدود اور بلا روک ٹوک قبضہ کو معاشی نظام کی بنیاد قرار دینا، جیسا کہ پروفیسر WILLIAM N. LOCKS^۱ نے کیا ہے محل نظر ہے۔ جہاں تک اشتراکیت کو ایک نظام کا نام دینے کا سوال ہے تو خود ہی مصنف اس کی بقولہوں نوعیت کو بیان کرتے ہوئے درج ذیل اقتباس نقل کرتا ہے :-

"It is both abstract and concrete, theoretical and practical, idealist and materialist, very old and entirely modern; it ranges from a mere sentiment to a precise programme of action; different advocates present it as a philosophy of life, a sort of religion, an ethical code, and economic system, a historical category, a juridical principle; it is a popular movement and a scientific analysis, an interpretation of the past and a vision of the future, a war cry and the negation of war, a violent revolution and a gentle revolution, a gospel of love and altruism, and a campaign of hate and greed—the hope of mankind and the end of civilization, the dawn of the millennium and a frightful catastrophe".^۲

اس تصویر میں مبالغہ ضرور ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس تحریک نے دوسری ان تمام تحریکوں کی طرح جو انسان کے اپنے ماحول کے خلاف بد عمل کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں بدلتے ہوئے حالات کے تحت ہمیشہ اپنی نوعیت بدل لی ہے۔ یہ بات بجائے خود اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ اس کو ایک مثبت نظام کا نام نہیں دیا جاسکتا۔

بعض فضلاؤں نے اشتراکیت اور سرمایہ داری پر اظہار خیال کرتے ہوئے اسلام

^۱ Comparative Economic Systems, 6th Edition, P-17

^۲ A. Shadwell, in Quarterly Review, July, 1924 P-2, for reference Pl: see; Comparative Economic Systems: William N. Locks, P-179.

میں ذاتی ملکیت کے تصور کو کچھ اس انداز سے پیش کیا ہے جس سے مستحصل سرمایہ دار کو بلاوجہ کی شبہ طعنی ہے۔ اسلام نے یقیناً ذاتی اور انفرادی ملکیت کے ابتدائی تصور کو گوارا کیا ہے مگر استحصال یا ارتکاز کی حد تک پہنچنے سے پہلے اس کی ماہ میں سخت رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں۔ جو مذہب ذرائع پیداوار کے ارتکاز پر اس سختی سے بھنجھوڑتا، تو اسے سرمایہ دار کا پشت پناہ ہونے کا الزام ہرگز نہیں دیا جاسکتا۔ ارشاد ہے:

وَالَّذِينَ يَكْنُزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَفْقَهُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ نَبِئْهُمْ بِذُنُوبِهِمْ

يَوْمَ يَحْمَلُونَ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتَكُونُ بِهِمْ أَجَابِهِمْ وَقَدْ جَاءَهُمْ هَذَا مَا كُنْتُمْ لَا تَفْهَمُونَ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنُزُونَ ۝

اس نئے نظامِ زکوٰۃ میں دیگر حکمتوں کے ساتھ یہ حکمت بھی پوشیدہ ہے کہ سال کے انتقام پر ریاست کو آزادانہ طور پر اس بات کا جائزہ لینے کا موقع ملے کہ فرد پیداواری ذرائع پر کسی حد تک کا بغض ہو چکا ہے ہر چند کہ اسلام کو اپنے نئے نظامِ معاش پر اعتماد ہے کہ اس نظام کے تحت کسی کے اثر و با بن جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا پھر بھی وہ سوسائٹی پر گہری نظر رکھنا ضروری سمجھتا ہے تاکہ ہر قسم کی بے جا مہنگائی میں آتی رہے یہ بھی معلوم ہے کہ اس نے سرمایہ دار کو مستقل الٰہی عظیم دے رکھا ہے کہ:

فَاتَّعَدُوا فَاذْذُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ

(ترجمہ) اگر تم نے اس طرح نہ کیا تو پھر الٰہی عظیم قبول کر دو جب تک کہ اللہ اور اس کے رسول سے۔

اس حکم کے ساتھ اگر حضرت ابوبکرؓ کا مانعین زکوٰۃ کے سلسلہ میں یہ فرمان بھی تلا لیا جائے:

وَمَنْ حَفِيَ عَقْلًا لَا يَزِدُّهُ دَنًا إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَأْتَلُنَّمْ ۝

تو اس سے عیاں ہو جائے گا کہ اسلام کسی قیمت پر بھی سرمایہ دار کے ایک حد سے آگے بڑھنے دینے کا روادار نہیں۔ پھر کمانے، خرچ کرنے، حلال، حرام، اسراف و تبذیر اور انفاق فی سبیل اللہ کے متعلق مفصل احکامات کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام انسانی کو دولت کا مالک نہیں بلکہ محض

ایمن بنانا چاہتا ہے۔ وراثت کے قانون میں اس نے مالک کو آعزاز منور دیا ہے مگر اختیار بالکل سلب کر لیا ہے۔ ذاتی ملکیت سخت احکام کے بوجھ تلے دب کر موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہتی ہے۔ اگر وہ دنیا کے لئے رحمت اور ایثار کا سپیکر بن کر مینا چاہتی ہے تو بسم اللہ وہ مالک کے لئے بھی رحمت ہوگی۔ ورنہ سرتا سر نہ رحمت ہوگی۔

اسلام نے ذاتی ملکیت کے ادارہ کا سراسر انکار بھی نہیں کیا۔ مگر اپنے حکیمانہ انداز سے اس کی مضروں کو ختم یا بالکل کم کر دیا ہے۔ تاکہ معاشرہ میں غرب محنت کش کو مقام مل سکے اور عزت کا عینا نصیب ہو۔ اور وہ معاشرتی طور پر بھی خوشحال زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکے۔ اس کا معاشرتی و معاشی ادارت میں اسلام کا یہ طریق کار نہایت موثر اور جامع حوال کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ بہت سی معاشرتی و معاشی تبدیلیاں اور اصلاحات اس آہستگی اور فرشی سے لاتا ہے کہ تبدیلی خوشگوار بھی ہو جاتی ہے اور کامیاب بھی رہتی ہے۔

اس بحث سے یہ واضح ہو گیا کہ ذاتی ملکیت — بالخصوص اسلام میں — کوئی ایسا ادارہ نہیں جسے معاشی نظام کا محور سمجھا جائے۔ اسی لئے شاہ صاحب نے بھی اس کو ایسی بنیادی حیثیت نہیں دی۔ انہوں نے معاشی نظام کا ایک حکیمانہ تجزیہ پیش کیا ہے۔ یہ تجزیہ ایک وقت کئی خوبیوں کا حامل ہے جو نظری بھی ہیں اور عملی بھی، مثال کے طور پر یہ نظریہ :

۱- ترقی پسندانہ (PROGRESSIVE) بھی ہے اور غیر متبدل (UN — CHANGEABLE) بھی۔

۲- ارتقائی (EVOLUTIONARY) بھی ہے اور انقلابی (REVOLUTIONARY) بھی۔

۳- منطقی (LOGICAL) بھی ہے اور فطری (NATURAL) بھی حتیٰ کہ وہ

۴- طبیعی (PHYSICAL) بھی ہے اور ما بعد الطبعی (META — PHYSICAL) بھی۔

الغرض یہ ان تمام خوبیوں کا جامع ہے جو ایک نظریہ میں ہونی چاہئیں۔

یوں تو شاہ صاحب نے بھی عام ائمہ معاشیات کی طرح معاشی مسئلہ کی بنیاد خواہشات پر رکھی ہے ان میں سے جب تک کہ جلی خواہشات کا تعلق ہے ان میں حیوان اور انسان مشترک ہیں۔ مگر انسانی خواہشات کا

دائمہ وسیع تر ہے جو خواہشات سے بڑھ کر ضروریات تک بھی پہنچتا ہے یہ ضروریات جمعی نہیں بلکہ عقلی ہوتی ہیں۔ کیونکہ باطل عقلی، ذہنی یا روحانی تقاضوں کے تحت ابھرتی ہیں۔ ان میں سے بعض شخصی ہوتی ہیں اور بعض اجتماعی۔ پھر انہیں معاشی، معاشرتی، سیاسی اور خلائی تمام ضروریات شامل ہیں

یہی وجہ ہے کہ انسانی خواہشات و ضروریات کی تکمیل ایک باقاعدہ نظام چاہتی ہے۔

اب سوال ہے ان خواہشات کی تسکین کا، جہاں تک عام ماہرین معاشیات یا معاشرتی مفکرین کا تعلق ہے ان میں سے کسی نے بھی اس سوال کا جواب دینے کی زحمت گوارا نہیں کی، کہ حیوانات میں بالعموم اور انسانوں میں بالخصوص خواہشات کی تسکین کے طریقے کیا ہو سکتے ہیں۔ مگر شاہ صاحب نے اس کا تفصیلی جواب دیا ہے اور پھر جو بات سب سے زیادہ قابلِ اعتناء ہے وہ یہ کہ انہوں نے اس کے ڈانڈے یا بعدالطبیعات سے ڈائیٹے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اللہ تمام کائنات کا خالق ہے اور اب بھی اس کے رب ہونے کی صفت کی نود سے محروم ہی ہے کہ اس کی مخلوقات کے ساتھ اس کا غیر منقطع رابطہ ہر وقت اور ہر آن برقرار رہے۔ تاکہ اس کی ربوبیت کے تقاضے پورے ہوتے رہیں اور یہ رابطہ اللہ اور اس کی مخلوق میں موجود ہے۔ شاہ صاحب کی اصطلاح میں اسے الہام، کہتے ہیں۔ یہ ایک مجرد حقیقت ہے جو ہے تو ایک مگر اپنے متعلقات کے اختلاف کے سبب اس کی کیفیت بدلتی رہتی ہے اس کی مثال انسانی روح کی ہے۔ وہ بھی ایک مجرد کیفیت ہونے کے باوجود آنکھوں میں نور، دل میں سرور، عقل میں شعور اور وجدان میں

لئے والانسان دبما ینبغث الی غرض معقول دین لہ ذرا عیۃ من طبیعۃ الخ حجة الله الی الخ ج اول ص ۳۸

۱۷ شاہ صاحب الہام اور وحی میں فرق مانتے ہیں فرماتے ہیں:

فرق در میان وحی و الہام بوجہ بسیار است سطحات، سلطنت (۱۶) لیکن الہام اور وحی شاہ صاحب کے نزدیک دونوں از مقتضائے حقوق تعالیٰ اعظم اند (سلطنت ۲۰)

۱۸ البدور البازعۃ ص ۱۹۳، جو بدیہی غیر محتاج الی بران نازل فی اصل طبیعۃ الانسان نزد معلوم

المعاشیۃ فی طبائخ الہام والیطور الخ۔

صنم ہے۔ ہاتھوں میں قوتِ بطش، پاؤں میں قوتِ کشی اور زبان میں قوتِ گویائی کی کیفیات اختیار کر لیتی ہے۔ ان تمام شکلوں میں ظہور پذیر ہونے کے بعد وہ وہی رہتی ہے جو ہے۔ یہی کیفیتِ الہام کی ہے۔

اس الہام کے ذریعے ہر جاندار کو اس کا علم ہوتا ہے کہ زندگی کیسے گزارے۔ فطرت کی متناکھیے پورا کرنے اپنے معاشی تقاضوں کا کیسے جواب تیار کرے۔ گویا ان خواہشات کی تسکین کے طریقے الہامی ہیں۔ شاہ صاحب کے نزدیک یہ ہر نوع کی جہاں معاشی شریعت ہے جو اس کی صورت و نوعیت کے مطابق اس کے افراد کے سینوں میں اللہ کی طرف سے القا کر دی جاتی ہے۔ شاہ صاحب کا خیال ہے کہ معاشی تسکین کا یہ طریقہ منطقی ہے۔ اس کو بالکل خارجی نہیں سمجھنا چاہیے کیونکہ جب خواہش جو ان ہوتی ہیں تو ہر نوع کی صورت و نوعیت خود بخود تقاضی ہوتی ہے کہ اسے روشنی ملے تاکہ وہ جگہ لگا سکتے۔ لہذا فطرت کے اہل اصول کے مطابق مشیتِ ایزدی سادہ ہوتی ہے اور نور ربوبیت سے حصہ نصیب ہوتا ہے۔ یہ تو تکوینی و معاشی الہام کی بات ہے۔ شاہ صاحب کے نزدیک تکلیفی و تشریحی الہام بھی بتقاضائے نوع انسانی ہے اس لئے عین مناسب فطرت انسانی ہے۔ کیونکہ انسانیت کو جو استعداد و صلاحیت فطرت کی طرف سے ودیعت ہوئی ہے وہ زبانِ حال سے آرزو مند ہوتی ہے کہ اسے مبداءِ فیض سے سب مال و روشنی نصیب ہو اس کے سبب فیضانِ رحمت اور کائنات کو بھی ہے۔ مگر حیوانوں میں جو معاشی الہام جبلت کی معرفت

۱۰ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو حجتہ اللہ الباقیہ ج اول ص ۳۸ و البدور البازغہ۔

۱۱ لکل نوع شرعیۃ منفشۃ فی صدور افرادہ من طریق الصورۃ النوعیۃ۔ حجۃ اللہ الباقیہ ج اول ص ۳۸

۱۲ کان من عناية اللہ الہاماً طبعاً مقصوداً صورۃ النوعیۃ۔ حجۃ اللہ الباقیہ ج اول ص ۳۸

۳۹ البدور البازغہ ۵۳-۵۵-

۱۳ حجۃ اللہ الباقیہ ج اول ص ۲۰-۲۳ قلیبہ ان التکلیف من مقتضیات النوع

وان الانسان یسئل ربہم بلسان استعداد الخ الطائف القدس: پس صورت

فوعیہ بلسان حال شرع لا از مبداء فیض مدبوحہ کہ وہ۔

۱۴ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو البدور البازغہ ص ۲۸، حجۃ اللہ الباقیہ ج اول ص ۳۸-۳۹-

ہوتا ہے اور انسانوں میں جو الہام حیلت و عقل و ادراک کی معرفت ہوتا ہے دونوں، مبداء و تشخص کے اعتبار سے متحد ہونے کے باوجود، ظہم الہیم کی صورت نوعیہ کے اختلاف کے سبب، کیفیت اور نتائج کے اعتبار سے مختلف ہو جاتے ہیں۔ حیوانی الہام ساکن رہتا ہے مگر انسانی الہام خود کار حرکی سلسلے کا روپ دھار لیتا ہے۔

شاہ صاحب کی فکر سے واضح ہوتا ہے کہ الہام کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں۔ الہام تکوینی جو اس نظام کائنات کو ترقی دینے اور اس کو برقرار رکھنے کے سلسلے میں ہوتا ہے۔ یہ جزوی بھی ہوتا ہے اور کلی بھی، اور اس کا تعلق ہر فرد سے ہوتا ہے۔ ان بعض ایسی باتیں جو فہم و ادراک کی متقاضی ہوتی ہیں ان کا تعلق صرف ان سے ہوتا ہے جن کو اس درجہ کی فہم ملی ہے۔ یاد دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ الہام ہر ایک سے متعلق رہتا ہے مگر اخبار صرف ان طبائع پر ہوتا ہے جن میں استعداد و صلاحیت ہوتی ہے اس میں شاہ صاحب تقویٰ و جہاد کی قید نہیں لگاتے، صرف فہم و ادراک کو ضروری قرار دیتے ہیں۔

الہام کی دوسری قسم اعلیٰ تر ہے اس سے انسانیت کا کمال معراج و وابستہ ہے۔ الہام کی اس قسم کو وحی الہی سے تعبیر کرتے ہیں۔ انبیاء فطری طور پر خاص اسی مقصد کے لئے پیدا کئے جاتے ہیں۔ وہ ابتداء ہی سے حکیم اور محصوم ہوتے ہیں۔ ان کی طبائع غایت درجہ لطیف، ان کی استعداد کمال اور ان کے اخلاق پاکیزہ ہوتے ہیں۔ انہیں فطرۃً خسیرة القدس سے ایک ربط ہوتا ہے۔ انبیاء کی تعلیمات میں بھی معاد و معاش کے بنیادی اصول موجود ہوتے ہیں۔ یہ اصول دیگر تمام الہامات کیلئے ضابطہ تصحیح اور (Guideline) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ عام الہامات جن طبائع پر ہوتے ہیں ان کو وہ کمال اور لطافت نصیب نہیں ہوتی، الہام کے لئے ان کی فہم و ادراک اور تعبیر میں لغزش یقینی ہوتی ہے۔ نبوی شریعت ان کی اس غلطی کا انار کرتی اور امتدال داتی ہے لہذا ان میں سے جو شریعت کے خلاف ہوں ان کو ترک کرنا لازمی ہے۔

شاہ صاحب کی اس تقریر سے مفہوم ہوتا ہے کہ ایسے عام تکوینی الہامات از قسم معاش و معاشرت، جو شریعت کے بنیادی اصولوں کے مطابق ہوں اور ان کی روح کے تضاد نہ ہوں، خدائے ایزدی کی عکاسی کرتے ہیں، اس لئے علوم الاقتصاد وغیرہ کے مسائل جو انسانیت نے اپنے تجربات و الہامات سے حقیقت دیتے ہیں۔ شاہ صاحب کی نگاہ میں قابل تقلید نمبریں گے کیونکہ انسانیت کے لئے ضروری ہیں۔

اس اعتبار سے شاہ صاحب اسلامی تاریخ میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے خاص دنیوی علوم کو جو انسان کی دینی زندگی کی فلاح اور ارتقاء سے متعلق ہیں، بشرطیکہ شریعت کے خلاف نہ ہوں، بالحدیثی استناد بخشا ہے اور انہیں مہم من اللہ قرار دیا ہے اور ان کی یہ سوچ قرآنی آیات پر مبنی ہے۔

اس سے ماہرین معاشیات کی تمام فکری تفصیلات پر نہ تو مہر جواز ثابت کرنا ہے اور نہ ہی ان کو تقدس کا کوئی رنگ عطا کرنا ہے، مگر انسانی کاوشوں کو خواہ وہ دنیا کے کسی گوشہ سے کیوں نہ کی گئی ہوں، ٹھکرادینا یا ان سے یوں صرف نظر کر لینا کہ جیسے وہ دنیا میں موجود ہی نہیں علم و حکمت کے قصبہ روار کھنے کے مترادف ہوگا۔ حالانکہ ہمارے آقا و مولا نبی اُمّی لقب صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے :-

كَلِمَةُ الْحِكْمَةِ ضَالَةٌ الْعَامَّةِ وَجَدَهَا فَهَوَاحِ بَهَا،

اس فرمان کی رو سے تو علم و دانش کی توہیر جہاں کہیں سے بھی اُبھرے اس کی جگہ بہر حال ہومن کا سینہ ہے۔ اور یہ اس کو سمونے کے لئے یوں فراخ ہے جیسے وہ اس کی اپنی میراث ہو۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان علوم سے پہلو آتی کرنا یقیناً انسانی زندگی کی علمی و عملی ترقی کیلئے مفید نہ ہوگا لہذا لوگوں نے علم و دانش کے انمول ذخیروں کے ساتھ کوئی ایسا سلوک روار کھا ہے جو ناروا ہے تو اس کے ذمہ دار وہ خود ہوں گے اور پھر کفر و ضلالت کے لئے کوئی روک ٹوک نہیں جو ہر چاہے منہ اٹھا کر چل دے مگر ہومن کے لئے ایک اور صورت ایک اہ ہے وہ ہے صراطِ مستقیم۔ یہ وہ ماہ ہے جو اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے زمینیں کڑی ہے۔ اسے حق نہیں کہ وہ اس سے سر ٹوا دھر اُدھر ہو سکے۔ اس لئے دنیا میں جس نے بھی کچھ سوچا ہے اس میں کسی نہ کسی حد تک روشنی کا عنصر ضرور موجود ہے، اور اس سے استفادہ کرنا ضروری ہے۔

اس کے ساتھ اس امر کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ یورپی ماہرین معاشیات نے علمی تفصیلات میں سنگین غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے اور زبردست ٹھوکریں کھائی ہیں۔ بڑی حد تک جمود و تعطل اور اندھی تقلید کا شکار ہوئے ہیں۔ یہاں ہمارے لئے ممکن نہیں کہ ہم ان کی غلطیوں کی تفصیل سے نشاندہی کر سکیں یا اس وقت صرف دو باتیں بطور مثال عرض ہیں۔ پہلی غلطی علمی تجزیہ سے متعلق ہے اور دوسری عملی زندگی میں ان کے طریق بحث کی افادیت سے متعلق ہے۔

۱- زندگی ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے۔ انفرادی ہو یا اجتماعی۔ انسانی زندگی کا مطالعہ کرتے ہوئے اس کے حصے بخرے کرنے سے جو نتائج حاصل ہوں گے وہ سراسر غیبِ حقیقی ہوں گے۔ اسی لئے قرآن مجید نے زندگی کے اعمال و افعال پر تبصرہ اور ان کا تجزیہ کرتے ہوئے ان اعمال کی عکاسی بعینہ اس ترتیب سے کی ہے جس ترتیب سے وہ عملی زندگی میں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ یہی فطری اور صحیح طبعی کار ہے۔ اس راہ سے ہٹ کر تجزیہ کر کے جو جو مفروضات قائم کئے جائیں گے وہ یقیناً غلط ہوں گے۔ ہمارے یورپی مفکرین قرآنی راہ سے نہ جانے کیوں منحرف ہیں اور پھر ان کو اس انحراف پر اصرار بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے معاشی ادارات کی افادیت اور ان کی قدر و قیمت کو جانچنے کے لئے ہمیشہ انہیں دیگر معاشرتی ادارات سے بالکل جدا کر کے تجزیہ کیا ہے جس کے سبب انہیں شدید عملی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ انسانیت کا اعتقاد ہے وہ سنگین غلطیوں کے ترکیب ہوئے ہیں۔ اس طرح ان کی کیفیت ان کے بصرونِ حقیقیہ سے ہر ایک نے باطنی کے کسی ایک عضو کو چھو کر دیکھا تھا اور اس طرح اپنے طوطا پر ایک مفروضہ قائم کر لیا تھا کہ باطنی ایسا جانور ہو گا۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے جس چیز کو چھو کر دیکھا تھا وہ صحیح تھی اور جو نتیجہ اخذ کیا تھا وہ غلط تھا۔ صورت حال یہاں بھی ایسی ہی ہے۔ خدا کا فضل ہے کہ اب ان میں سے کچھ کو اس کا احساس ہونے لگا ہے اگرچہ غلطی سے باز آنے کا ارادہ وہ اب بھی نہیں رکھتے۔

۲- ان کی دوسری زبردست غلطی مبالغہ آمیزی اور ریاضیاتی فارموں پر مزودت سے زیادہ انحصار ہے۔ فطرت کے سادہ اور عام فہم اصولوں کو ریاضیاتی اشکال میں الجھا کر ایک چستان بنا دینے کا بچکانا جام ہو گیا ہے۔ اب وہ ریاضیاتی مساواتوں میں ایسے الجھے ہیں کہ عملی زندگی میں مساوات کو پانے کا احساس ہی جاتا رہا ہے۔ گویا کاغذ پر ٹیڑھی تر بھی خود ساختہ اشکال میں مساوات پا کر وہ مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اب معاشرتی مساوات میرا آگئی اور افسوس ناک بات یہ ہے کہ وہ اس میں برابر الجھتے چلے جا رہے ہیں۔ نتیجتاً عملی میدان میں ان کی افادیت صفر سے گر کر منفی محض ہو چکی ہے۔

تاہم یہ مباحث نظر سنیاتی انا دیت سے کسر خالی بھی نہیں۔ زاویہ نگاہ بدلنے کی ضرورت ہے کہ ان کو غیر ضروری موٹو گائیٹوں سے پاک کر کے الہامی توہیرات کو اجاگر کیا جائے تاکہ اس سے عملی زندگی سدھارنے میں مدد ملے۔ لیکن یہ کام وہی کر سکتا ہے جس کو سید الکونین کی تعلیمات سے نو بہیرت حاصل ہو۔ یہ ایک دعوتِ عمل ہے تاکہ دنیا کو معاشی مسائل کے گرداب سے نکالا جاسکے :

AVAILABLE

Amin

JUTE PRODUCTS

OF ALL SPECIFICATIONS
FINEST QUALITY

HESSIAN CLOTH
JUTE TWINE
JUTE YARN



JUTE THE BEST PACKING MATERIAL
MOST DURABLE
MOST ECONOMICAL

CONTACT:

AMIN FABRICS LTD.

STATE LIFE BUILDING NO. 1-B, STATE LIFE SQUARE,
OFF. I. I. CHUNDRIGAR ROAD, POST BOX NO. 4411, KARACHI-2.
PHONES PABX 234778-9 & 234087

adcom 206-8